مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی قرآنی خدمات

(تفسیر ماجدی کا خصوصی مطالعہ)

ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

شخصی احوال

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۵/مارچ ۱۸۹۲ء-۶/جنوری ۱۹۷۷ء) کے آباء وجداد میں شیخ محمد مخدوم چشتی نظامی (۸۸۰ھ/۱۴۷۵ء) شمالی ہندوستان کے ایک نامور صاحب علم وبصیرت گزرے ہیں۔ جو عوام میں اپنی روحانیت اور خدمت خلق کی وجہ سے آب کش (پانی کا منتظم) کے لقب سے معروف ہوئے۔ نواب دریا خان کی خواہش پر وہ ۱۴۴۱ عیسوی میں ضلع بارہ بنکی میں منتقل ہوئے جو بعد میں دریاباد کے نام سے معروف ومشہور ہوگیا۔ مخدوم آب کش کے پوتے مخدوم بخش مولانا عبدالماجد دریابادی کے پردادا تھے۔ نانا مفتی مظہر کریم نے فرنگی محل لکھنؤ سے فقہ اور افتاء میں تخصص حاصل کیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ کے زمانہ میں وہ شاہجہاں آباد میں منصفی کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ صادر کیا تھا، جن کی پاداش میں انھیں چودہ سال کی قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور وہ انڈمان کے جزیرے میں جلاوطن کردیئے گئے۔ ان کے والد عبدالقادر (۱۸۴۸ء-۱۹۱۲ء) نے ابتدائی تعلیم فرنگی محل میں حاصل کی۔ انھوں نے قانون میں اختصاص پیدا کیا۔ وہ ۱۸۹۰ء کی دہائی میں یوپی کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کلکٹر بنائے گئے۔ عبدالماجدؒ دریابادی کی والدہ ماجدہ (۱۸۵۳ء-۱۹۴۳ء) صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔ وہ مشترکہ خاندان کے تمام افراد کے لیے یکساں شفیق وخدمت گزار تھیں انھوں نے اپنی اولاد کو اسلامی عقائد اور دینی اعمال کا خوگر بنانے میں پوری دلجمعی سے دلچسپی لی۔

عبدالماجد دریابادی نے چار سال تک گھر کے ایک مولوی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ان سے شیخ سعدی کی گلستاں، بوستاں اور پند نامہ اور مولوی اسماعیل میرٹھی کی اردو ریڈرس پڑھیں۔ انگریزی حساب اور دیگر مضامین کی تعلیم کے لیے مختلف اساتذہ ان کے گھر پر آیا کرتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مذہبی ماحول میں ہوئی۔ والد ماجد کے علم دوست اور مذہبی رفقاء کی آمد ورفت سے گھر کا ماحول ہمیشہ مذہبی بنا رہا۔ نویں سال میں وہ درجہ چہارم میں ایک اسکول میں داخل کیے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں ہائی اسکول پاس کیا۔ اور ۱۹۱۰ء میں انھوں نے انٹرمیڈیٹ، کیننگ

کالج لکھنؤ، سے مکمل کیا۔ ۱۹۱۰ء میں اسی کالج میں انھوں نے بی اے میں داخلہ لے لیا۔ بی اے میں ان کے مضامین: انگریزی، فلسفہ اور عربی تھے۔ ان کے فلسفہ کے اساتذہ کے نام ایم پی کیمرون اور سی جے براؤن تھے۔ لکھنؤ میں اپنے زمانہ طالب علمی میں وہ علامہ شبلی نعمانی (و:۱۹۱۴ء) سے ان کی علمی وادبی عظمت کی وجہ سے قریب ہوگئے۔ جہاں مولانا آزاد، سید سلیمان ندوی، عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا، پنڈت برج نرائن چکبست، اکبرالہ آبادی، عبدالسلام ندوی اور مولوی مسعود ندوی وغیرہ سے تعلقات استوار ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں کالج سے بی اے کرنے کے بعد انھوں نے علی گڑھ کالج میں ایم اے فلسفہ میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۳ء میں الہ آباد میں ایم اے سال اول کا امتحان دیا کیوں کہ ایم اے او کالج اس زمانہ میں الہ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ علی گڑھ کے اساتذۂ علم فلسفہ سے غیر مطمئن ہونے کے نتیجہ میں انھوں نے اسی سال اگست ۱۹۱۳ء میں سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں ایم اے فلسفہ میں داخلہ لیا جہاں وہ خوش اور مطمئن لیکن ۱۹۱۲ء میں والد گرامی کے انتقال اور تعلیمی وظیفہ کی عدم دستیابی کے نتیجہ میں وہ ایم اے مکمل نہیں کرسکے۔ دریابادی اپنی زندگی کے دس سالہ دور (۱۹۰۸ء/ ۱۹۱۸ء) کو ظلمت وتاریکی کا دور قرار دیتے ہیں۔ یہی دور تھا جب کہ یورپ کے مستشرقین نے ہونہار نوجوان عبدالماجد دریابادی کی Psychology of Leadership کو ۱۹۱۵ء میں لندن کے ایک معروف علمی اشاعتی ادارے سے شائع کیا۔ اس کتاب میں مغربی ملحدین اور فلسفیوں کے زیر اثر نوخیز دریابادی نے عقیدہ آخرت اور رسالت پر تردد کا اظہار کیا۔ دوسری طرف خالق کائنات کی نیرنگیوں کے طفیل اکبرالہ آبادی (و:۱۹۲۱ء)، علامہ شبلی، مولانا محمد علی جوہر (و:۱۹۳۱ء) اور مولانا اشرف علی تھانوی (و:۱۹۴۳ء) کی خصوص عنایتوں دلپذیر نصیحتوں اور علمی وعملی بلندیوں نے منکر خدا ماجد دریابادی کو خادمِ دینِ ملت، اور عاشقِ قرآنِ وسنت بنادیا۔[1]

تفسیر ماجدی کی بابت اہل علم کی آراء

استشراقی فلسفہ کے بطن سے نکل کر اسلامی فلسفہ کے گیسوئے سنوارنے والی شخصیت کا نام مولانا عبدالماجد دریابادی ہے، جنھوں نے انکار خدا سے اعتراف خدا کے تجرباتی مشاہدے کیے۔ اور ایک صاحب طرز ادیب، معروف نقاد، ماہر فلسفہ ونفسیات نیز انگریزی مترجمِ قرآن وشارحِ قرآن اور اردو مترجمِ قرآن وشارحِ قرآن کی متعدد حیثیتوں میں آج اکیسویں صدی کے عالمی افق پر زندہ وپائندہ نظر آتے ہیں۔

مولانا دریابادی نے انگریزی کا ترجمہ قرآن ۱۹۴۱ء میں مکمل کرلیا تھا، جس کی اشاعت ۱۹۵۷ء میں تاج کمپنی کراچی، پاکستان سے ممکن ہوسکی۔ درحقیقت محمد مارماڈیوک پکتھال (و:۱۹۳۶ء) اور عبداللہ یوسف علی (و:۱۹۵۳ء) کے انگریزی تراجم قرآن کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کا ترجمہ ایک نایاب خدمت قرآنی ہے، جس نے ایک طرف پکتھال کے ناکافی اور عبداللہ یوسف علی کے تسامحات سے پُر، کاوشوں کا نہ صرف تریاق فراہم کیا

بلکہ انگریزی خواں طبقے کی دینی وعلمی ضروریات کو پورا کرنے کا قابل ستائش فریقہ انجام دیا[۲]

دوسری طرف مکمل قرآن کا ترجمہ اور اس کی تفسیر کے طبع اول کا مسودہ بقول مولانا عبدالماجد چار پانچ سال کی مدت میں ۱۹۴۳ء میں ختم ہوگیا تھا۔ چار سال کے اوپر کی مدت مسودہ کی کانٹ چھانٹ اور صفائی یعنی مسودہ سے مبیضہ بننے میں لگ گئے۔ ۱۹۴۸ء تک مبیضہ ناشر صاحب کے ہاتھ میں پہنچ گیا پھر جو کچھ گزری اور کتاب جب اور جس ہیئت اور صورت کے ساتھ ۱۳، ۱۴ سال کے صبر آزما انتظار کے بعد یعنی ۱۹۶۳ء میں پریس سے باہر نکلی۔ اس کے تذکرے سے اب کچھ حاصل نہیں۔[۳]

تفسیر ماجدی کے خصائص وامتیازات کے تفصیلی تذکرے سے قبل امت اسلامی کے چند اکابرین کی آراء کا تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ قاری کو اس کی عظمت کا ادراک ہوجائے۔ مولانا قاری محمد طیب قاسمی فرماتے ہیں:

تفسیر ماجدی، حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی شاہ کار کتاب ہے، جس میں تمام علم دوست طبقوں بالخصوص نو تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے ان کی نفسیات کے مطابق کافی سامان فراہم کردیا گیا ہے۔ تفسیر کی پاکیزہ زبان، بلیغ تعبیر، جامع مضامین اور قرآنی حقائق کی سہل ممتنع انداز سے تفہیم اس تفسیر کے خاص امتیازات ہیں۔ مجھے تفسیروں میں دو چیزوں کی جستجو اور تلاش رہتی تھی۔ ایک یہود ونصاریٰ سے متعلقہ آیات میں قرآن نے جن تاریخی پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں ان کی بقدر ضرورت تاریخی تفصیل کہ اس کے بغیر قرآن حکیم کا وہ مطمح نظر پورا سامنے نہیں آسکتا جو ان آیات سے متعلق ہے۔ دوسرے یہ کہ توراۃ وانجیل اور قرآن حکیم کے مقاصد کا تقابلی انداز سے موازنہ کہ اس کے بغیر قرآنی مقاصد کی بالادستی اور برتری سامنے نہیں آسکتی۔ اس جلیل القدر تفسیر میں کتاب کھولتے ہی پہلی نظر میں یہی دو مقصد سامنے آگئے اور عرصہ دراز کی تشنگی اکدم بجھتی نظر آئی۔ اس لیے میں اپنے اس ذہنی نقطہ نظر سے انہی دو پہلوؤں کو تفسیر کے امتیازی پہلو سمجھنے پر مجبور ہوں۔[۴]

مولانا محمد ادریس بلگرامی ندوی کہتے ہیں:

مفردات قرآن کی تحقیق، نحوی مشکلات پر تنبیہ، ادبی لطائف کا ذکر، کلامی مباحث کی ضروری تشریح، تاریخی واقعات پر مستند معلومات، آیات سے مستنبط مسائل کی طرف اشارات، یہ امور اس تفسیر کی اہم خصوصیات میں سے ہیں۔ زبان کی سلاست اور روانی ان سب سے ماسوا ہے۔ پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں جو اہم علمی خدمات انجام پائی ہیں یہ تفسیر ان میں ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے اور ان شاء اللہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ، علماء اور مدارس عربیہ کے منتہی طلبہ، سب کے لیے مفید اور بے حد کارآمد ثابت ہوگی۔[۵]

مولانا سعید احمد اکبرآبادی فرماتے ہیں:

علمی، تحقیقی اور ادبی حیثیت سے تفسیر ماجدی مولانا کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جس کی آب وتاب وقت گزرنے کے ساتھ اور بڑھے گی اور آئندہ نسلیں شکر گزاری کے ساتھ انھیں یاد کریں گے۔[۶]

مولانا محمد منظور نعمانی نے لکھا ہے:

ان کا سب سے بڑا کانامہ ان کی تفسیر قرآن ہے۔ چوں کہ مولانا کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور خاص کر یہود ونصاریٰ کی تاریخ اور توراۃ وانجیل وغیرہ صحف قدیم کی شروح اور ان سے متعلق کتابوں کے مطالعہ کا انھوں نے خاص اہتمام فرمایا تھا، اس لیے ان کی تفسیر میں بہت سی ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو دوسری تفسیروں میں نہیں ملتیں اور قرآن پاک کے سمجھنے میں ان سے بڑی مدد اور رہ نمائی ملتی ہے۔[۷]

تفسیر ماجدی کی خصوصیات اور اس کی انفرادیت پر اپنے مفصل مضمون میں مولانا عبداللہ عباس ندوی نے اخلاص، علم اور کسی رہبر مخلص اور اس راستہ کے تجربہ کار پیر ودانا کی سرپرستی اور اس کی ہدایات کے حصول کو تین اہم امتیازات قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مفسر دریابادی کو یہ تینوں نعمتیں حاصل تھیں۔ جو ایک ساتھ بہت کم کسی کے حصہ میں آئی ہیں۔ تفسیر وترجمہ قرآن کی خدمت انھوں نے محض اللہ کی خوشنودی اور رضا کے لیے شروع کی۔ وہ اردو اور انگریزی کی تفسیروں پر گہری اور وسیع نظر رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قرآن کریم کی ایسی تفسیر سامنے آنی چاہیے جس میں مدافعانہ انداز نہ ہو بلکہ ایجابی طور پر مخالفینِ اسلام کا رد بھی ہوجائے اور اہلِ طلب کو قرآن سے ہدایت کا حصول آسان ہوجائے۔[۸]

سید ابوالحسن علی ندوی (و: ۱۹۹۹ء) نے تفسیر ماجدی کو معاصر عہد کی ضرورت قرار دیا ہے اور اس کے خصائص کا ذکر تفصیل سے کیا۔ انھوں نے مغربی زبان وماٰخذ سے نابلد حضرات کو بطور خاص تفسیر ماجدی کے طفیل مفسر ممدوح کا شکر گزار ہونے کی تلقین کی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''اب یہ نیا دور تھا، عقلی علوم اور فلسفہ یونان کے بجائے تجربی علوم، سائنس، بالخصوص طبعیات کا دور دورہ تھا، ہر شعبہ میں نئے نئے اکتشافات وتحقیقات ہورہی تھیں، تاریخ وجغرافیہ کے علم نے وہ اہمیت حاصل کرلی تھی جو انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی، تمدن، علم المعیشت، اقتصادیات اور قانون نے غیر معمولی وسعت اور مقبولیت حاصل کرلی تھی، بہت سے قدیم تاریخی مسلمات اور جغرافیائی روایات محلِ نظر، بلکہ خلافِ واقعہ سمجھی جانے لگی تھی، نئی کھدائیوں اور آثارِ قدیمہ کی دریافت نے نئی نئی حقیقتوں کی نقاب کشائی کی تھی، اس سب سے عالمِ اسلام بالخصوص اس کے علمی طبقہ پر ایک نئی ذمہ داری عائد

ہوتی تھی۔ اب ان جدید معلومات وتحقیقات کی روشنی میں اعجازِ قرآن اور صداقتِ قرآنی کو اسی طرح عیاں اور عالم آشکارا کرنا تھا، جیسا کہ قدیم علماء و متکلمین، اور مفسرین قرآن کو اپنے زمانہ میں یونانی فلسفہ اور حکمت اور الحاد و باطنیت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اور انھوں نے علمی وعقلی دلائل سے قرآن مجید کی حقانیت کو ثابت کیا تھا۔

اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے لیے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے کمرِ ہمت باندھی، اور انگریزی اور اُردو میں اپنے تفسیری نوٹس کے ذریعہ اس خدمت کو انجام دیا، اس کام کی تکمیل کے لیے ہمارے علم میں وہ موزوں ترین آدمی تھے۔ اس لیے کہ وہ جدید علوم میں بصیرت رکھتے تھے، اُن کو مطالعہ کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا، ان کی نظر میں غیر معمولی وسعت اور ثقافت میں تنوع تھا، وہ جدید طبقہ کی نفسیات اور ذہنی ساخت سے واقف تھے، علم کے تیز رفتار رواں دواں قافلہ سے وہ کبھی پچھڑنے نہیں پائے اور اس تفسیری خدمت کے دوران میں تو انھوں نے خاص طور پر اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی ایسی کتاب ان کی نظر ومطالعہ سے بچنے نہ پائے جس سے قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق میں کچھ بھی مدد ملتی ہو، سالہا سال کی اس کوشش ومطالعہ اور عرق ریزی کا نتیجہ اُن کی انگریزی اور اردو کی تفسیر ہے۔

...ہمارے محدود علم میں (اور یہ بات وسیع سفروں اور سیاحتوں، یورپ اور امریکہ کے سفروں اور وہاں کی بہت سی علمی کوششوں سے واقفیت کے بعد لکھا جارہا ہے) اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کے ایک محقق اور فاضل یگانہ اور خادمِ دین مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو توفیق دی کہ وہ تقابلِ مذاہب اور تقابلِ صحف سماوی کا منظم، وسیع اور مخلصانہ مطالعہ فرمائیں اور کم سے کم انگریزی میں شائع ہونے والی تنقیدی، احتسابی وتقابلی کتابوں، موسوعات، انسائیکلوپیڈیاز، اور وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے مضامین ومباحث کا مطالعہ جاری رکھیں، اور ان کے حوالہ ونشان دہی سے بدیہی حقائق کی طرح قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی محفوظیت اور تورات وانجیل کے تحریفات، خارجی اضافات اور ذات وصفات خداوندی کے خلاف بیانات اور نسبتوں سے پردہ اٹھائیں، یہ ایک خادمِ دین مترجم ومفسر قرآن کا وہ کارنامہ اور اس کے اخلاص وبلند ہمتی کا شاہکار ہے، جس میں راقم حروف کی نظر میں اُن کا اس عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ کسی اسلامی ملک میں بھی کوئی ہمسر اور نظیر نظر نہیں آتا۔[9]

تفسیر ماجدی کا مطالعہ: چند امتیازات

حقیقت یہ ہے کہ یہ بے نظیر تفسیر مولانا عبدالماجد دریابادی کی اسلامی فکر اور تحقیقی مزاج کی بھرپور رعایت کرتی

ہے۔ سطور ذیل میں ایک اجمالی مطالعہ کے ذریعہ اس کے چند اہم علمی پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ ترجمہ وترجمانی

مترجم قرآن نے از اول تا آخر متن قرآن کا خود ترجمہ کیا ہے۔ کسی دیگر ترجمہ کا چربہ پیش نہیں کیا ہے لیکن دلیل راہ حکیم الامت کے ترجمہ کو بنایا ہے۔[10] قرآن کے ہر ہر حرف، فعل، ضمیر نیز صِلات وموصولات اور ان کے مراجع کی تلاش میں انھوں نے بے پناہ محنت کی ہے۔ اور کبھی اپنے مشکل مسائل ترجمہ کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سامنے رکھا، ان سے سوالات کیے، کبھی اطمینان کی رسید دی اور کبھی ان کو واضح کر کے ان سے اختلاف بھی کیا۔[11]

یہ اختلاف اور فہم مطالب کبھی کبھی نحوی اور صرفی نوعیت کے ہوتے اور کبھی کبھی تاریخی قسم کے بھی۔ ان اختلافات کے تصفیے کے لیے قدیم تفاسیر، انسائیکلوپیڈیا اور اہل کتاب کی باقیات سے استفادہ کرتے ہیں۔ قرآنی مطالب کو مولانا نے قرآنی الفاظ کی روح کے عین مطابق کرنے میں بھی بے پناہ محنت کی ہے۔ چنانچہ عربی مبین کو اردوئے مبین میں منتقل کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ مولانا کا ترجمہ نہ لفظی وحرفی ہے اور نہ اسے ترجمانی ہی کہا جاسکتا ہے بلکہ لفظی اور ترجمانی کے درمیان کی ایک جز ہے۔ مولانا نے ترجمہ میں اصطلاحات کی دقت اور الجھن کو بھی دور کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اصطلاحات بہت بعد کی پیداوار ہیں، قدیم لفظی ولغوی اشتراک سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ مثلاً ''صلوٰۃ'' کا ترجمہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے ضمن میں ''نماز'' سے کرنا غیر منطقی ہوگا اور اس تصور میں قیام، قعود، رکوع، سجود وغیرہ اسلامی ارکان کو شامل نہیں کیا جاسکتا بلکہ ''پوجا'' یا ''پوجا پاٹ'' بھی کافی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح پیکر عصمت ومتانت حضرت یوسف کو ایک خادم کی حیثیت سے دیکھ ایک جاہلی ملک کی امیر زادیاں پکار اٹھیں تھیں إنْ هذا مَلَكٌ كريمٌ تو مَلَكٌ کا ترجمہ فرشتہ سے کرنا صحیح نہ ہوگا۔ فرشتہ کا تخیل مشرک قوموں میں سرے سے تھا ہی نہیں۔ یہ تو سراسر اسلامی تصور ہے یہاں ترجمہ دیوتا یا دھرماتما سے کرنا مناسب ہوگا (جلد اول، ص۴۲)۔ مولانا کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں حشو مطلق نہیں ہے۔ ہر عبارت پر تکرار کا الگ الگ مفہوم ہے۔ فَبِاَيِّ آلاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانُ کی تکرار میں بھی الگ الگ مفاہیم کی نشاندہی کی گئی ہے۔

مولانا عبدالماجد نے ترجمہ کے مسائل پر اپنے افتتاحیہ (ا) طبع ثانی میں کھل کر بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو اور عربی کے درمیان صرفی، نحوی، انشائی حیثیت سے گویا مشرق ومغرب کا فرق ہے۔ عربی میں جو اسلوب بیان وضاحت کے اعلیٰ معیار پر ہے وہ اردو میں آکر کہیں کہیں غیر فصیح ہی نہیں مہمل بن جاتا ہے۔ عربی میں زور وتاکید کے موقع پر ضمیر کو بے تکلف مکرر بلکہ تین تین بار لے آتے ہیں جیسے إنّه هُو يُبدئُ ويُعيدُ - إنّكَ

أنتَ العَزِيزُ الحكيمُ – إنّا سَمِعنا – إنّني أنا اللهُ – انا نحنُ نُحي الموتىٰ – نحن نزّلنا علَيك۔ اب اگر لفظی ترجمہ کی دھن میں اس قسم کی ترکیبوں میں بھی ضمیر غائب ''وہ'' یا ضمیر حاضر ''تو'' یا ضمیر متکلم ''میں'' یا ''ہم'' دہرا کر یا تہرا کر لائی جائے تو اردو عبارت تو غارت ہی ہو جائے، لازماً اردو میں اس مفہوم کو لانے کے لیے اردو ہی کے اسلوب سے کام لینا پڑے گا اور ضمیر کی تکرار سے نہیں، بلکہ ضمیر کے ساتھ کہیں ''ہی'' سے کام لیا جائے کہیں ''تو'' (بہ واوٴ مجہول) لگا دیا جائے گا اور کہیں ''ہی'' اور ''تو'' دونوں کو ملا کر کام لیا جائے گا۔ اسی طرح اردو میں حال اور مستقبل کے دو صیغے مستقل الگ الگ ہیں عربی میں دونوں کے لیے ایک ہی صیغہ مضارع کا ہے جسے بجنسہ اردو میں لے آنے کی کوئی شکل ہی نہیں اور ترجمہ کے لیے ناگزیر ہے کہ دو میں سے کوئی ایک صیغہ حسب مقتضائے مقام اردو کے لیے متعین کرے۔ اسی طرح تثنیہ کو جمع سے ممتاز کرنے کے لیے اردو میں لفظ ''دو'' یا ''دونوں'' کی تصریح لازمی ہے... عربی کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ فقرے میں فعل کو مکرر لے آتے ہیں کہیں فعل ہی کی کسی حالت میں اور کہیں اسے اسمی یا مصدری صورت دے کر اور کہیں موصوف کو صفت خود اسی لفظ سے لے آتے ہیں۔ أعذّبُه عذابًا – فيميلُوا ميلاً – فرضتُم لَهُنّ فريضةً – مَكراً مكرتُموه – قتّلُوا تقتيلاً – يُفجّروا تفجيراً – يُخرِجُكم إخراجاً وغیرہ بیچاسوں ترکیبیں اس قسم کی قرآن میں آئی ہیں اور عربی میں عین فصاحت کے معیار پر ہیں، لیکن اردو میں وہی لفظ دہرا دینے سے بات بالکل ہی نہ بن سکے گی اور اردو میں اس موقع کے لیے کوئی دوسرا لفظ ہی لانا پڑے گا۔ کہیں ''بہت'' کہیں ''بڑا'' کہیں ''خوب'' کہیں ''خوب ہی'' کہیں ''مار کے'' وقس علی ھذا... اسی طرح ایک خاص عربی ترکیب فزادھم اللهُ مَرضاً کی ہے۔ اب اگر اس کا تحت اللفظ ترجمہ ''بس بڑھا دیا ان کو اللہ نے از روئے مرض'' کر دیا تو اس بیسویں صدی والے عام اردو خواں کے پلّے کیا پڑے گا؟ لازم ہے کہ عربی ترکیب سے ہٹ کر سلیس اردو میں ''بس اللہ نے ان کا مرض بڑھا دیا'' لایا جائے۔ اور ایسی ترکیبیں قرآن میں ایک جگہ نہیں بلکہ متعدد موجود ہیں... ایسی ہی ایک اور الجھن صیغہ مجہول کو ترجمہ میں مجہول رکھنے میں کبھی کبھی پیش آ جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال قرآن کے شروع ہی میں غیرِ المغضُوبِ عَلَيهم میں ملتی ہے۔ چنانچہ مترجمین کو اس کا ترجمہ صیغہ معروف میں کرنا پڑا ہے ''تو'' یا ''تیرا'' کے اضافے کے ساتھ مثلاً نہ وہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا ہے'' یا'' نہ وہ جن پر تو غصہ ہوا ہے۔[۱۲]

مولانا نے ''لغات اضداد'' کو مترجم کے لیے ایک مشکل مرحلہ قرار دیا ہے۔ مثلاً ''شراء'' خرید اور فروخت دونوں کے لیے آتا ہے ''رجاء'' امید و بیم دونوں موقعوں پر استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح اختلاف قرأت کا مسئلہ بھی دشوار کن ہوتا ہے کیوں کہ دو قرأتیں وارد ہوئی ہیں اور دونوں متواتر ہیں، وہاں اعراب بدل گئے ہیں۔ مثلاً

فامسَحُوا بِرؤسِكم وارجلَكم میں ارجلکم کی قرأت نصب کے علاوہ جر کے ساتھ بھی متواتر ہے... انتشار ضمائر کا مرحلہ بھی کچھ کم نازک و دشوار نہیں۔ ایک ہی آیت بلکہ ایک ہی جزو آیت کے اندر ایک ہی ضمیر کا مرجع ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ اور ہو گیا۔ ایسے موقع پر اگر خود سیاق کلام کے بعد رہنمائی حدیث و آثار سے نہ مل جائے تو مترجم غریب کا تو کام ہی تمام ہو جائے!

...پھر ایک بڑی دقت ان الفاظ قرآنی سے پیدا ہو گئی ہے جو اردو میں چل گئے ہیں بلکہ ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں۔ یہ چیز تو بظاہر بڑی آسانی پیدا کرنے والی ہے اور نو آموز مترجم اس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ ترجمہ کی ضرورت ہی کیا، یہ تو خود اردو بن گئے ہیں، لیکن حقیقت حال اس کے برعکس ہے... اشتراک صوری کے باوجود اختلاف معنوی کی ممکن صورتیں تین ہیں اور تینوں ہی ترجمہ قرآن کے سلسلہ میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً رب، جہاد، ظلم، وثوق، شراب، آیت، خیر، زکاۃ، فضل، دین، عرش، سماء، جاہل، نسل، مکر، کید، اجل، مجاہدین، شیطان جنت وغیرہ بیچاسوں قرآنی لفظ اس قبیل کے ہیں کہ انھیں ہر جگہ اردو میں منتقل کر دینا فہم قرآنی پر شدید ظلم ہوگا۔ مولانا کی تفصیل کا اختیار یہ ہے کہ کہیں تحدید و تخصیص اور کہیں تفہیم و توسیع کے علاوہ تیسری صورت یہ ہے کہ (الف) یا تو قرآنی لفظ نے اردو میں آ کر ایک دوسرے معنی اختیار کر لیے ہیں۔ (ب) اور یا اس نے دو مشہور قرآنی مفہوموں کے بجائے ایک ہی مفہوم اردو میں قبول کیا ہے۔ مثلاً وسیلہ، محراب، فوج، ذرہ، غلام، مشفق، ناصح، غصہ، غرور، عارض، اعتبار، تاویل، کشف، فتح، ارث، بلا، قاصد، فتنہ فلک، عام، سیارہ، ذکر، بری، اسباب، تمیز، اعلام، مجنون، شہید، رقیب، قہر، عورہ، ممنون، صاحب، تکلیف وغیرہ بطور محض نمونہ۔[۱۳]

۲۔ مسلک سلف کا اتباع

مسلک اہل سنت والجماعت کی پیروی اس تفسیر کا دوسرا نہایت اہم پہلو ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ مقلد و متبع سلف مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے مرشد مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مانند اسلاف صالحین کے فطری منہج سے سرمو انحراف نہیں کیا ہے تاہم جابجا اپنی تحقیقات کے نتیجہ میں اجتہاد کی راہ بھی اپنائی ہے۔ البتہ یہ تمام اجتہادات لغوی، تاریخی اور اصطلاحی نوعیت کے ہیں۔ ان اختلافات کے نتیجہ میں بسا اوقات قرآن کی نئی جہات سامنے آ جاتی ہیں جو اکیسویں صدی میں فہم قرآن کے لیے نہایت مفید بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی جدید مفسر کے لیے جگہ جگہ بعض نہایت ضروری شرائط کا اضافہ کرتے ہیں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

...اس لیے لازمی ہے کہ جدید مفسر و شارح قرآن، تاریخ اقوام پر نظر بھی رکھتا ہو اور جغرافیہ عالم پر بھی، یہودیت و نصرانیت، مجوسیت اور نواحِ عرب کے شرکیہ مذاہب سے بھی فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو۔ اور جدید سائنس

کے بھی شعبوں (خصوصاً) فلکیات سے بھی مطلقاً بے بہرہ نہ ہو، ورنہ باوجود تدیّن وتقویٰ، صالحیت ومقبولیت کے سخت علمی غلطیوں کا شکار ہوجائے گا اور اس کا قلم کہیں فرعون اور لشکر فرعون کی غرقابی کو بجائے بحر قلزم کے دریائے نیل میں دکھائے گا، کہیں حضرت مسیح کا تلوار سے قریب القتل ہوجانا بیان کرے گا اور کہیں فرعون کو کسی تاجدار کا شخصی نام سمجھ کر دعویٰ الوہیت اس کی شخصیت کی جانب منسوب کرنے لگے گا۔[۱۴]

مولانا فرماتے ہیں کہ استاذ کی ضرورت جب چھوٹے چھوٹے علم اور سہل سے سہل فن میں پڑتی ہے تو قرآن کا علم تو سارے علوم کا بادشاہ اور سب سے بڑھ کر مہتم بالشان ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ قرآنیات کا کوئی طالب علم استاد سے اور اگلے ماہرین فن کے نتائج تحقیق سے بے نیاز رہ کر اس کی منزلیں طے کرے اور اگر کسی کو بدقسمتی سے (ان سطور کے راقم کی طرح) کوئی زندہ استاد کامل الفن نہ میسر آئے (گو ان سطور کے راقم کو مولانا حمیدالدین فراہی، صاحب نظام القرآن، اور حضرت مولانا تھانوی صاحب معارف القرآن کی سرسری صحبتیں کچھ عرصہ ضرور نصیب رہی ہیں۔) تو اس خلا کو اکابر مفسرین اور محقق شارحین کی کتابیں ایک بڑی حد تک پُر کرسکتی ہیں...ان حضرات کی تلاش، تفحص، تحقیق کی داد دل سے دیجیے، ان کی سپاس گزاری کے لیے قلب کی گہرائیوں کو وقف کردیجیے...لیکن اس انتہائی قدر ومنزلت اور آخری احترام واعتراف کے بعد بھی، یہ عقیدہ ذہن میں تازہ رکھیے کہ نبی معصوم کے بعد کوئی بھی معصوم امت میں نہ ہوا ہے، نہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے فکر، فہم واجتہاد کے لحاظ سے ہر بڑے سے بڑا محقق بھی غیر معصوم ہی ہے''۔[۱۵]

۳-صحف سماویہ (توراۃ وانجیل) سے تقابل اور استشہاد

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی انگریزی تفسیر میں بطور خاص مستشرقین اور یورپ کے محققین کی سامنے قرآن کی عظمت وبرتری ثابت کرنے کے لیے خود ان کی مذہبی مقدس کتابوں سے سینکڑوں اقتباسات نقل کرکے انھیں لاجواب کردیا ہے۔ ان کی اردو تفسیر بھی اس قدر سے خالی نہیں ہے۔ صحف سماویہ کے حوالے بے شمار مفسرین نے دیئے ہیں چنانچہ ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) سے لے کر ابن کثیر الدمشقی تک نے کتب ابن الاحبار، وہب ابن عتبہ، عبدالملک بن عبدالعزیز ابن الجریح الرومی سے استفادہ کیا ہے۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی نے لکھا ہے کہ مفسر دریابادی کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے سلف کے مختار قول کو نقل کرنے کے بعد اس کی اصل توراۃ وانجیل کے تحریف شدہ نسخوں میں تلاش کی پھر، جیوش انسائیکلوپیڈیا، انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجین اینڈ اتھکس میں علمائے یہود ونصاریٰ کی قدیم وجدید تحقیقات کا مطالعہ کرکے یہ دکھایا کہ قرآن ہی تنہا وہ آسمانی صحیفہ ہے جو ان مسخ شدہ روایات کی تصحیح کرسکتا ہے۔ انھوں نے اس مقام پر سورہ بقرہ کی دو آیات اَلَم تَرَ اِلَی الَّذِی

حَاجَّ اِبراهیم فِی ربّه -الآیة ۲۵۸ (کیا تو نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کی جس نے ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں مباحثہ کیا) اور وَقَالَ لَهُم نَبِیُّهم اَنَّ آیتَ مُلکِه اَن یَاتِیَکم التابوتَ فِیه سکینة مِن ربّکم -الآیہ (اور ان سے ان کے نبی نے کہا کہ اس کی امارت کا نشان یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق تو از خود آجائے گا) نقل کی ہیں اور مولانا عبدالماجد کی تحقیق کو خود ان کے الفاظ میں درج کیا ہے۔[۱۶]

صحف سماویہ سے بھرپور استفادہ کے نتیجہ میں تفسیر ماجدی تقابل ادیان کا ایک معتبر ترین حوالہ ثابت ہوچکی ہے۔ یہودیت ونصرانیت کے ساتھ مفسر گرامی نے جگہ جگہ ہندوستان کے قدیم مذاہب اور ان کی قدیم کتب کے بھی حوالے پیش کیے ہیں۔ چنانچہ ان مباحث کے ذریعہ ہندو میتھالوجی، ہندوستانی تہذیب وثقافت اور رسوم ورواج کے مصادر اصلیہ سے واقفیت ہوجاتی ہے۔

تقابل ادیان کے ضمن میں کتب سماویہ (محرف شدہ) پر شدید تنقید کرتے ہیں اور اس تنقید کے نتیجہ میں روشن خیال مسلمانوں کی مرعوبیت اور مغربی محققین کی منافرت ومنافقت کا علم قاری کو بحسن وخوبی ہوتا جاتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیں:

۱-وَقَالَت طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهلِ الْکِتٰبِ آمِنُوا بِالَّذِیَ أُنزِلَ عَلَیه (آل عمران:۷۲) پر حاشیہ میں لکھتے ہیں:

...اور آج یہ بڑے بڑے فرنگی ''محققین''، یہود ومسیحی مستشرقین نے انگریزی زبانوں میں سیرت نبوی لکھنے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اپنے علم وتحقیق، وسعت مشرب اور بے تعصبی کی دھاک بیٹھا کر تمہید بڑے زور کی اٹھاتے ہیں اور معلوم یہی ہونے لگتا ہے کہ پیغمبر عرب اور مصلح عالم کی نعت اور مقنن اعظم اور مثیل موسیٰ کی منقبت میں دریا بہادیں گے لیکن آگے چل کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) انھیں کچھ خلل دماغ سا تھا یا یہود ونصاریٰ کی کتابوں کے مضامین کہیں سے سن سنا کر انھیں چرالیتے ہیں۔ تو یہ بھی ٹھیک قدیم یہودیانہ دجل وتلبیس کا ایک جدید فرنگی نمونہ ہے اور بس۔[۱۷]

وَمَا کَفَرَ سُلَیمانُ وَلٰکِنّ الشّیٰطِین کَفَرُوا (البقرہ:۱۰۲) اور سلیمان نے (تو کبھی) کفر نہیں کیا، کی تشریح ملاحظہ کریں:

(جیسا کہ ناسپاسوں، کافروں، افتراپردازوں نے مشہور کر رکھا ہے) کہتے ہیں: سلیمان کو پیغمبر ماننے والی دو قومیں مسلمانوں سے پہلے بھی ہوچکی ہیں، یہ دونوں وہی ہیں جو اہل کتاب کہلاتی ہیں یعنی یہود ونصاریٰ، ان دونوں کے اکابر نے ستم ظریفی کا کمال یہ دکھایا ہے کہ ایک طرف تو ان کی عظمت وپیمبری کے قائل ہیں اور دوسری طرف ان

کے نامہ اعمال میں گندے سے گندے جرائم بھی ڈال دیے ہیں! یہاں تک کہ کفر و شرک بھی کہ اللہ کی عدالت میں کوئی جرم اس سے بڑھ کر یا اس کے برابر بھی سنگین تصور میں نہیں آسکتا۔ یہودی قصص و حکایات اور مسیحی آثار وروایات کی کتابوں کو چھوڑیے خاص الخاص بائبل یعنی عہد عتیق کے صحائف جن پر یہود و نصاریٰ کا ایمان ہے، انھیں ملاحظہ کیجیے کہ اس مجموعہ میں آج تک کیا تصریحات لکھی چلی آرہی ہیں۔ جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا۔ (سلاطین ۱۱:۴،۶،۱۰) یعنی غفلت یا عدم اعتناء کی بنا پر عملی کوتاہی یا عصیان نہیں صریح بدعقیدگی، توحید ہی کی طرف سے بے یقینی... آگے اور ملاحظہ ہو:

سواز بس کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا۔ اس لیے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا (سلاطین، ۱۱:۹-۱۰) معاذ اللہ! خدا کا پیمبر اور کفر و شرک میں مبتلا... یہاں تک کہ قرآن آیا جو ہر قوم، ہر زمانہ کی سچے پیمبروں کی عزت و ناموس کا محافظ ہے اور اس نے آکر یقین نہ کرنے والی دنیا کے سامنے آکر اعلان کیا کہ سلیمانؑ کو معاذ اللہ کافر کہتے ہو! وہ تو کفر کے قریب تک نہیں گئے تھے۔ قرآن کی صدائے حق فضا میں بلند ہو کر خاموش ہوگئی... یہاں تک کہ تیرہ ساڑھے تیرہ صدیاں گزر گئیں اور اب قدرت حق کا اعجاز دیکھیے کہ اب جو محققانہ و فاضلانہ کتب جوامع وحاویات بائبل ہی کے پرستاروں کے قلم سے نکل رہی اور شائع ہو رہی ہیں، وہ تائید و تصدیق، بائبل کے الزام دہی کی نہیں، قرآن کے جواب صفائی کی کر رہی ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا، برطانوی کاوش و تحقیق کا لب لباب ہوتا ہے، اس کے سب سے آخری ایڈیشن میں مقالہ زیر عنوان سلیمان نکال کر دیکھیے، صاف یہ مضمون ملے گا

''سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے''۔[۱۸]

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، خاص مسیحی فضلا اور پرستاران بائبل کی تحقیق و تدقیق کا ثمرہ ہے۔ اس میں تو یہاں تک ہے کہ بائبل کی جو آیتیں بھی اوپر نقل ہو چکی ہیں ان کا حوالہ دے کر یہ لکھ دیا ہے کہ یہ عبارتیں بعد کی بڑھائی گئی ہیں۔ اور الحاقی ہیں! اور پھر لکھا ہے:

یہ تو غالباً صحیح ہے کہ سلیمان کی بیویاں متعدد تھیں اسرائیلی بھی اور غیر اسرائیلی بھی، لیکن انھوں نے نہ تو سب کے لیے قربان گاہیں تیار کرائیں، اور نہ خود خدائے واحد کی پرستش کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش کا تجربہ ہونے دیا (کالم ۹۷۶۴) [۱۹]

حقیقت یہ ہے کہ تفسیر ماجدی میں تقابل ادیان پر مواد کثیر ہے اور جدید تحقیقات کے ذریعہ کتب قدیمہ کی

افترا پردازیوں اور دسیسہ کاریوں کا خود تریاق بھی فراہم کر دیا گیا ہے جو قرآن مجید کے بے لاگ تبصروں کی تائید کرنے والا ہے۔

۴۔ تفسیر ماجدی کے سائنسی مباحث

تفسیر ماجدی گزشتہ اور رواں صدی میں تصنیف کردہ تفاسیر میں اس حیثیت سے بھی نمایاں ہے کہ اس نے کتاب ہدایت میں مذکور سائنسی مباحث کا بھی احاطہ کر لیا ہے اور نہ صرف سائنسی بلکہ ارتھمیٹک، منطق، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ کے علوم پر جگہ جگہ قیمتی معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس ضمن میں پہلے خود مصنف گرامی کے چند جملے ملاحظہ کر لیں:

...لیکن قرآن میں صرف یہی کچھ نہیں ہے، ضمناً اور بالواسطہ تاریخ، جغرافیہ اور سائنس کے سینکڑوں نکتوں پر گفتگو آئی ہے اور ان مادی حقیقتوں پر بھی روشنی پڑتی چلی گئی... چاند، سورج اور ستاروں کے بیان کیے گئے تو قصداً ایسی عبارت میں جو اس زمانہ کے مسلمات عقلی و فکری سے ٹکراتی نہ ہو لیکن اتنی لچک رکھتی تھی کہ جب صدیوں کے بعد نظریات فلکی بدل جائیں تو الفاظِ قرآن کی تفسیر و تشریح جب بھی ذہنوں پر گراں نہ ہو، زمین کی کرویت اور زمین کی گردش اور سورج اور چاند کی خلائی گردشیں سب کی سب کھل کر اس نے اس زمانہ میں بیان نہیں کیں... جب کہ یونان کے حکیم، ہندوستان کے مہندس، عراق و مصر کے منجّم سب اس کے قائل و معتقد تھے کہ آسمان نام ہے ایک بڑی اور ٹھوس چھت کا، جس میں ستارے، چاند، جڑے اور جُڑے ہوئے ہیں، اگر بیان کر دیتا تو کون اس کلام کو قابل اعتنا سمجھتا اور کتنی بحثیں عقلی اور دماغی، اصل مقصد ہدایت سے بالکل الگ نہ بچھڑ جاتیں! لامحالہ حکمتِ خداوندی نے ایسا اعجازی طریقہ کلام اختیار کیا کہ جس سے ظاہری مطلب تو اس زمانہ کے مزعومات، مسلمات اور معتقدات کے مطابق نکل آئے لیکن اتنی گنجائش اس میں ہو کہ جب عقل انسانی بلوغ کو پہنچ جائے اور علوم و فنون برگ و بار لے آئیں تو وہی کلام معنی و مفہوم، علوم عصری کے عین مطابق دینے لگے اور کلام کا یہ اعجاز بجائے خود اس کی حقانیت کی ایک مستقل دلیل بن جائے۔ اور صادقین مومنین کے علاوہ باہر والے بھی بہ قدر اپنے ظرف و نصیب کے اس سے مستفید ہونے لگیں۔[۲۰]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''قرآن اگرچہ صراحۃً کہیں بھی دعوت دنیا کے چلے ہوئے علوم و فنون کی طرف توجہ کی نہیں دیتا، لیکن ساتھ ہی مطالبات ایسے کرتا ہے کہ کہیں بہ قاعدہ اشارۃ النص اور کہیں بہ قاعدہ اقتضاء النص کہ دوسرے علوم و فنون کی تحصیل کچھ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ مثلاً جہاں ترکہ کا حکم ہے فرمایئے کہ اس کی تعمیل بغیر علم الحساب (ارتھمیٹک) کے ممکن کیوں کر ہے؟ یا اس قسم کے جو ٹکڑے جا بجا آتے گئے ہیں: قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ - اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى

الاَرض — ان پر عمل درآمد بغیر جغرافیہ کے میدان میں قدم رکھے کیونکر ممکن ہے، اسی طرح اس مضمون کی جتنی آیتیں آئی ہیں؟ اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لآیاتٍ لاُولِی الاَلْبَاب ان کے ذیل میں مفسر کی نظر علوم طبیعی وفلکیاتی میں جتنی گہری ہوتی اس کو حکمت وصنعت وتکوینی کے کیسے کیسے دلائل وشواہد ملتے جائیں گے۔ دریا، پہاڑ، شجر وحجر، جمادات ونباتات اور حیوانات کی پیدائش کے جہاں جہاں تذکرے آئے ہیں ان کے تعین وتحقیق نے کتنے ہی سائنسی علوم کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ یَتَفَکَّرُون — یَفْقَهُونَ اور یَعْلَمُونَ وغیرہ کی تاکید وتفصیل سے اگر منطق اور استدلالات فکری کی طرف رہنمائی مقصود نہیں تو اور کیا ہے؟ اور نوح وابراہیم، اسحاق واسماعیل، ایوب ویونس، داؤد وسلیمان، موسیٰ وہارون، یعقوب ویوسف، عزیز وزکریا، یحییٰ وعیسیٰ، لقمان وذوالقرنین اور قوم عاد وثمود، تبع اور فرعون وقارون وہامان کے نام لے آنے سے ملکوں ملکوں کی تاریخ کی طرف توجہ دلانا تو بالکل ظاہر ہی ہے۔ جتنی صحیح وتاریخی دریافتیں ان شخصیتوں اور ان قوموں سے متعلق فراہم ہوتی رہیں ان شاء اللہ قرآن کا زر خالص اور زیادہ ہی نکھرتا آئے گا۔[۲۱]

سائنسی مباحث کی تفہیم کے لیے تفسیر ماجدی کے چند مباحث کا مطالعہ انتہائی مفید ہوگا:

۱- وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ (البقرہ:۲۲) کے تحت لکھتے ہیں:

قرآن مجید کا کام مسائل طبعیات، فلکیات، جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم دینا نہیں بلکہ ان عالم گیر مشرکانہ عقائد اور جاہلی تخیلات کی تردید ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہے تمام تر قادر مطلق ہی کی کارفرمائی کا ثمرہ ہے... پانی خصوصاً بارش کا پانی کو جو دخل ہر قسم کی زمین پیداوار اور نباتات سے ہے اور پھر بالواسطہ اور براہ راست بھی حیوانی اور انسانی زندگی کے قیام وبقا میں ان سب کی تفصیل اگر لکھی جائے تو بجائے تفسیر قرآن کے ایک ضخیم سائنسی مقالہ تیار ہو جائے۔

۲- هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الأَرْضِ جَمِيعاً (البقرہ:۲۹) کے تحت حاشیہ ہے:

مرتبہ انسانی کا یہ شرف واحترام اسلام ہی کا قائم کیا ہوا ہے۔ ڈارون کے ترقی یافتہ بندر غریب کو اس رتبہ و مقام سے کیا واسطہ، ارتقاء کائنات کا اصل الاصول بالکل صحیح مان لیا جائے جب بھی اس کی ڈارونی تعبیر کی گمراہی تو بدستور رہے گی۔[۲۲]

۳- سَبْعَ سَمٰوَاتٍ (البقرہ:۲۹) پر حاشیہ اس طرح ہے:

قدیم اہل ہیئت نے سات آسمانوں سے مراد سات مشہور سیاروں کے مدار لیے ہیں... جدید ترین فلکیاتی تحقیق کے مطابق جو بھی تشریح کی جائے قرآن سے باہر نہیں بلکہ قرآن کے اندر ہی ہوگی۔[۲۳]

۴- وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيفَةً (البقرہ:۳۰) کے تحت لکھتے ہیں:

...اس لیے لازم ہے کہ انسان کو جب خلافت تفویض ہو تو رب الارباب کی اس کائناتی تکوینی حیثیت سے بھی ہو، اور انسان ان سارے قوانین فطرت پر غالب ومتصرف ہو کر رہے۔ انسان مادی، مشینی، ترقیاں جتنی بھی کرتا جائے گا وہ سب شواہد اس کی اس خلافت تکوینی کے ہوں گے۔ یہ نت نئے ایجادات وانکشافات اس کی فلاح روحانی اور نجات اخروی نقطہ نظر سے جتنے ہی لاحاصل ہوں، عبث اور بے کار ہوں، بہر حال ہیں سب اس کی خلافت تکوینی ہی کے مظاہر۔[۲۴]

۵- کُلٌّ یَّجْرِی لاَجَلٍ مُّسَمًّی

یعنی ہر ایک کی معیاد مقرر ہے، ایک منزل معین ہے ہر ایک کے قوانین منضبط ہیں اور ایک عجیب بات ہے کہ سائنس کی جتنی ترقی ہوتی جاتی ہے فلکیات کے قاعدے ضابطے اجرام فلکی سے باہمی فاصلے، ان کی رفتار کے حساب وکتاب سب سے زیادہ منضبط نظر آنے لگتے ہیں۔ قرآن مجید نے انہی کو آیات الٰہی ٹھہرایا ہے۔ ان کی جزوی تفصیلات میں گئے بغیر اور وہ تفصیلات تو ایسی ہیں کہ ان کی تحقیقات کا سلسلہ برابر پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ حرف آخر ان کے باب میں کب اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

یہ چند مثالیں پیش کی گئی ہیں جن سے اس تفسیر کے سائنسی مباحث کے تجزیاتی نقطہ نظر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سائنسی آیات اور ان کی تشریح میں ممدوح گرامی سائنس زدگی کا شکار کہیں نظر نہیں آتے بلکہ سائنس کی تیز رفتار ترقیوں، اس کے کلیات واصول میں تبدیلی اور درماندگی کا جگہ جگہ اظہار واعتراف کرتے ہیں اور پورے اعتماد کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ آئندہ ہونے والی ترقیات بھی قرآن کے فلسفہ عروج کا ہی حصہ ہوں گی۔ جن کی پوری گنجائش خالق کائنات کی تکوینی اسکیم میں موجود ہے۔

۵- قدیم اہل علم سے استفادہ

تفسیر ماجدی میں چودہ سو سالہ تراث اسلامی کا ایک عظیم دفتر سمو دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس تفسیر کے اندر علوم ومعارف کا سیل رواں جاری ہو گیا ہے۔ نحوی وصرفی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے کشاف کا سہارا، لغات قرآن کے حل کے لیے الجمہرۃ فی اللغۃ، لسان العرب، تاج العروس سے استفادہ، مفردات القرآن کے لیے، اصفہانی، بجستانی، دینوری اور الفراہی کی حوالے، اعراب القرآن کے لیے ابوالبقاء، ابوعبیدہ، معمر، ابوزکریا الفراء، کی تخلیقات دل کی سختی کو نرم بنانے والے واقعات کے لیے روح المعانی آلوسی، جامع عربی علوم قرآن میں الاتقان فی علوم القرآن، البرھان فی علوم القرآن، مفاتیح الغیب رازی، تفسیر ابن کثیر، مدارک

التنزیل، التفسیر القیم، کے علاوہ فقہی مسائل کے لیے ابوبکر جصاص، ابوبکر محمد بن العربی مالکی، اور ملا جیون امیٹھوی سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ اردو تفاسیر میں اشرف علی تھانوی کو کلیدی اہمیت دیتے ہیں اور 'مرشدی' مرشد مفسر، حضرت مرشد کے القاب سے نوازتے ہیں چنانچہ ہر دوسرے تیسرے صفحے پر ''بیان القرآن'' کی گونج تفسیر ماجدی کا نمایاں وصف ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے فکری ورثے کے مولانا اشرف علی تھانوی نہایت معتبر امین تھے اور ان سے انسلاک اور رہنمائی کے خود عبدالماجد دریابادی سلف صالحین سے رابطہ کے لیے ضروری تصور کرتے تھے۔ ان کے علاوہ امیر علی ملیح آبادی، عبدالحق حقانی، ثناء اللہ امرتسری، ثناء اللہ پانی پتی، شاہ عبدالعزیز، محمد علی لاہوری، سید ابوالاعلیٰ مودودی، شبیر احمد عثمانی اور ابوالکلام آزاد کی آراء سے انھوں نے استفادہ کیا ہے۔[۲۵]

استفادہ کے چند نمونے

۱۔ سورہ الفاتحہ کی وجہ تسمیہ اور لغوی تحقیق کے لیے مفردات غریب القرآن، (راغب)، تفسیر مجاز القرآن، لسان العرب، کلیات ابوالبقاء، التفسیر لاحکام القرآن، قرطبی، جامع ترمذی، الاتقان کے حوالے درج کرتے ہیں۔[۲۶]

۲۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کی نحوی، لغوی اور اصطلاحی معانی ومطالب کو احکام القرآن، ابن العربی، تاج العروس، تفسیر مجاز القرآن، ابن کثیر، البحر المحیط کے ذریعہ قیمتی نکات پیش کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ اللہ، خدا کے لیے اسم ذات ہے کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ فارسی میں ''خدا'' یا انگریزی میں ''گاڈ'' کی طرح اسم نکرہ نہیں کہ معبود واحد کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی بولا جاسکے۔ اس کی جمع نہ آئی ہے، نہ تثنیہ، نہ یہ کسی لفظ سے مشتق ہے اور نہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن ہے۔[۲۷] ''الرحمن'' پر کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں: یہ بات اتفاقی نہیں بہت پُرمعنی ہے کہ قرآن مجید میں اسم ذات کے بعد جو سب سے پہلا اسم صفاتی ارشاد ہوا ہے وہ صفت رحمانیت کا مظہر ہے۔ لین پول (Lane Poul) انگریز اسی لیے اپنے ہم قوموں کو سنا کر کہتا ہے کہ:

لوگ یہ بات برابر بھول جاتے ہیں کہ قرآن کے اندر وصف رحمت پر کتنا زور دیا گیا ہے۔[۲۸]

الرحمن اور الرحیم کی دیگر تفصیلات کے ساتھ ان کا یہ نکتہ ملاحظہ کیجیے:

صوفیانہ مذاق پر ایک تشریح یہ بھی کی گئی ہے کہ رحمانیت وہ تربیت ہے جو ذرائع و وسائط کے ساتھ ہو اور رحیمیت وہ تربیت ہے جو براہ راست و بلا واسطہ ہو، رحمانیت وہ شفقت ہے جو طبیب مریض کے ساتھ رکھتا ہے اور رحیمیت شفقت محض ہے (روح)۔[۲۹]

۴۔ ''یوم الدین'' کی تشریح کو امام رازی، ابن جریر، ابن القیم اور البغوی کی کتاب الاجناس کے ذریعہ

مکمل کرتے ہیں اور ان تمام کتب سے عربی عبارت نقل کرتے ہیں۔ ان کا یہ نکتہ دیکھیے:

ابن القیمؒ نے کہا ہے کہ سورہ میں پانچ اسماء الٰہی آئے ہیں اور پانچوں کی تشریح الگ الگ کی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسم اللہ کے تحت، اللہ صفاتِ جلال و جمال کا جامع ہے اور اس کے اندر وہ سب کچھ بالاجمال آگیا جس کی تفصیل اسماء حسنیٰ ہیں... اور اسم الرب کے تحت میں سارے صفاتِ فعل وقدرت، ضرر و نفع، عطاء نفع کے آگئے ہیں... اور اسم الرحمٰن کے تحت میں صفاتِ جود واحسان، بخشش وکرم، لطف ورافت آگئے... اور اسم الرحیم کے معنی میں اپنے بندوں پر رحم کرنے والا... اور اسم مالک کے تحت میں صفاتِ عدل، جزا وسزا اور اعزاز واذلال وغیرہ آگئے ہیں۔[۳۰]

۵۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَیْہِم (البقرہ:۶) اس ٹکڑے کی تفسیر میں مفسر مولانا عبدالماجد دریابادی نے بعض اجتہادی اقدامات کا سہارا لیا ہے لیکن یہ اجتہاد انقیاد اور فروش کے جذبوں سے مملو اور پُر ہے۔ انھوں نے مرشد تھانوی کو اس کی نحوی ترکیب کے سلسلہ میں لکھا انھوں نے جناب کا اتباع نہیں کیا ہے بلکہ صاف کشاف کی رائے کو ترجیح دیا ہے۔ اس کا جواب مرشد تھانوی کے دیا ''حکیم الامت'' میں موجود اس مراسلہ اور مرشد کے تفصیلی جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفسر مولانا عبدالماجد دریابادی اور مرشد مولانا اشرف علی تھانوی کے درمیان کس قدر گہرا علمی وتحقیقی لگاؤ تھا۔ اور کسر وانکسار اور جذب وانجذاب کا کس قدر خوبصورت انداز۔

حقیقت یہ ہے کہ قدماء کی آراء کا احاطہ محض چند مثالوں سے ممکن نہیں ہے۔ راقم کا احساس ہے کہ متقدمین کی امہات کتب کے ساتھ ساتھ ان کی آراء اور ان سے استفادے کی جہات پر الگ سے تحقیقی کام کیا جانا چاہیے۔ تاکہ تفسیر ماجدی کا یہ پہلو نکھر کر قارئین کے سامنے آسکے، اس تحقیق کے ذریعہ مفسر ماجد کے اجتہادی وتحقیقی بصائر سے واقفیت ممکن ہوسکے گی۔ بلکہ اس تحقیقی منصوبے کو خود مفسر گرامی کی ''حیوانات القرآن'' سے رہنمائی ملتی ہے، جو انھوں نے قرآن میں مذکور حیوانات پر ایک منفرد اردو انسائیکلوپیڈیا کی شکل میں تیار کردی ہے۔ امید ہے محققین اس جانب توجہ فرمائیں گے۔

ایجابی اور غیر مناظرانہ اسلوب

فلسفی ونقاد عبدالماجد دریابادی جب کہ وہ ''عبدالماجد ملحد قدیم'' تھے، نے اپنی انگریزی تحریروں میں دیگر امور ومہمات کے جلو میں فلسفہ آخرت ورسالت ہی پر سوالات کھڑے کردیئے لیکن اب جب کہ وہ ''عبدالماجد موحد جدید'' ہوئے اور انھیں کلمہ طیبہ کی تجدید کی توفیق نصیب ہوئی، ''سچ'' اور ''صدق جدید'' کے ذریعہ مذاہب منحرفہ، فرق باطلہ اور متجددین مسلمانوں کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیئے۔ لیکن جب انھوں نے انگریزی زبان میں تفسیر لکھی اور اس کے بعد اردو تفسیر مکمل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تو نہایت مہربان، شفیق اور مربی کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ ان

دونوں تفاسیر میں انھوں نے ایجابی اسلوب نگارش اختیار کیا ہے۔ احادیث نبویہ کی ایسی دلنشیں تشریح کی کہ منکرین حدیث ڈھیر ہوگئے۔ سورہ انفال، سورہ توبہ، سورہ احزاب کی بے شمار آیات کی محققانہ اور ایجابی تاویل پیش کرتے ہیں۔ مناظرانہ انداز تحریر سے یکسر احتراز کرتے ہیں۔ احادیث نبوی اور سلف صالحین کی آراء کا جس فراوانی اور فراخدلی سے استعمال کرتے ہیں اس نے منکرین حدیث، ملحدین، مناظرین اور گمراہ فرقوں کی نیندیں حرام کردیں۔

ایجابی پہلو کی مثالیں ہر جلد میں بکھری ہوئی ہیں چنانچہ واقعہ افک، ازواج مطہرات، حجاب، جہاد وقتال، ضال ومضل فرق، مدینہ سے یہودیوں کا اخراج، جنگوں میں اسلامی احکامات، معجزات کی بحث، توحید اور رسالت وغیرہ کی بحثیں، قاری کو مفسر گرامی کے ایجابی اور غیر مناظرانہ انداز تحریر سے واقف کراتا ہے۔ اس ضمن میں اقوام وملل کی امہات کتب کے علاوہ مستشرقین کی تیار کردہ دائرۃ المعارف سے سینکڑوں اقتباسات پیش کرکے اپنی تحقیقات کو پیش کرتے ہیں۔

طریقہ تفسیر کی چند ظاہری خوبیاں

تفسیر ماجدی کی معنوی خوبیوں میں سے چند کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا۔ اس تفسیر کی بے شمار ظاہری وصوری خوبیاں بھی ہیں، جو بہرحال اس کی مجموعی تصویر ہی کا ایک حصہ ہیں مثلاً:

۱۔قوسین کا استعمال

قوسین کا استعمال غالباً دنیا کے ہر اس مترجم نے کیا ہے، جس نے کسی بھی زبان کے خزانوں کو دوسری زبان کا جامہ پہنانے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ کلام الٰہی کو دیگر کسی بھی انسانی زبان میں منتقل کرنا دنیا کا دشوار ترین کام ہے۔ قوسین اس دشواری کے حل میں معاونت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوسین کے استعمال سے شاید دنیا کا کوئی بھی ترجمہ قرآن خالی نہیں ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے نہایت کثرت سے ''صنعتِ قوسین کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً الفاتحہ میں چھ عدد قوسین ہیں۔ پہلا قوسین حاشیہ نمبر۱۲ پر رحمٰن کے ذیل میں ہے جو اس طرح ہے: (جو دنیا میں سب کو رزق دے رہا ہے، سب کو راحت پہنچا رہا ہے، نفع رسانی کا دروازہ سب کے لیے کھولے ہوئے ہے۔) قوسین نمبر دو حاشیہ نمبر۱۳ پر رحیم کے ضمن میں ہے جو یہ ہے: (جو آخرت میں مومنین کو اجران کے استحقاق سے بہت زائد دے گا)...آخری چھٹا قوسین حاشیہ نمبر۱۹ پر غیر المغضوب علیہم پر ہے آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: نہ وہ لوگ جو زیرِ غضب آچکے ہیں (اپنی دانستہ وارادی کج روی کی بدولت)

پورے قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں ماجدی قوسین کے ذریعہ ایک طرف عربی زبان کے محذوفات کا علم ہوجاتا ہے دوسری طرف خود دریابادی کا نہایت ادبی ترجمہ مزید منقح ہوجاتا ہے۔ ضمناً یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ ان

تمام بریکٹس کے فوراً بعد حاشیہ کی عبارتیں شروع ہوجاتی ہیں۔ قوسین میں صرف اردو قاری کی رہنمائی کی گئی ہے۔ لہٰذا عربی محذوفات جو عربی مفسرین نے کیے ہیں بالعموم ان کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن یہ ذکر محذوفات قوسین کے بجائے اس کے بعد شروع ہونے والے حاشیوں میں لاتے ہیں۔ دوسری طرف حواشی میں ان قوسین کے ماسوا قوسین کی بھاری تعداد ان کی ہے جو خود ترجمہ کی عبارتوں کا حصہ ہے۔ جن کے محذوفات، اشارات اور اشکالات وہیں پر رفع ہوجاتے ہیں۔ ان قوسین کے ذریعہ اعلام، شخصیات، اماکن، اشاراتِ ضمائر، اور حالات وظروف کا نہایت ہلکا لیکن قیمتی اور ضروری رخ متعین ہوجاتا ہے۔

۲۔تحشیہ نگاری

معاصر تمام اردو تفاسیر کی مانند، یہ تفسیر بھی تحشیہ نگاری میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس کے حاشیوں میں معنوی، حرفی، لفظی، فکری، فنی، منطقی، سائنسی، اثری وجغرافیائی، فلکی، الغرض ہر طرح کے موتی مونگے نظر آتے ہیں۔ ان حواشی میں مشکلات القرآن، تاویل القرآن، قصص القرآن، امثال وتشبیہات، اماکن واعلام اور مختلف تہذیبوں کے رسوم ورواج کا بھرپور عکس آگیا ہے۔ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ سے جو نسخہ سات جلدوں میں ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا ہے اس کی رو سے کل ۸۲۹۳ (آٹھ ہزار دوسو ترانوے) حواشی ان میں موجود ہیں۔ یہ حواشی سورتوں کے اعتبار سے ہیں۔ مثلاً سورۃ الفاتحہ میں ۱۹ حواشی، سورۃ البقرہ میں ۱۱۳۰ حواشی، سورہ آل عمران میں ۴۱۸، جب کہ سورۃ النساء میں ۴۵۷ (جلد اول)، دوسری طرف اس مکتبہ سے انگریزی تفسیر Tafsirul Quran کی جلد اول میں سورۃ الفاتحہ میں ۲۴ حواشی، سورۃ البقرہ میں ۲۰۵ حواشی، آل عمران میں ۴۸۳ حواشی، اور سورۃ النساء میں ۱۳۴ حواشی ہیں۔ اردو اور انگریزی میں یہ فرق مسلمانوں اور غیر مسلموں کی ضرورتوں کے اعتبار سے ہے۔ انگریزی میں وہ تمام حواشی حذف کردیئے گئے ہیں جو ایک انگریز قاری یا مستشرق کے لیے غیر ضروری تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حواشی کی کثرت وقلت کے نتیجہ میں اردو میں سات جلد ہیں جب کہ انگریزی میں چار جلدوں میں پورے قرآن کی تفسیر اپنی اعلیٰ وشاہکار شکل میں معرض وجود میں آئی ہے۔

ایک نمائندہ حاشیہ کے عناصر ترکیبی

مثلاً علم آدم الاسماء (البقرہ: آیت ۳۱ کا حاشیہ نمبر ۱۱۳)

یعنی آدم کو اشیائے کائنات کے اسماء اور آثار وخواص کا علم دے دیا...آیت کے ان الفاظ سے اہل سنت وجماعت نے انبیاء کی تفضیل ملائکہ پر نکالی ہے۔ (معالم کی عربی عبارت نقل کرتے ہیں) اور آدم کی فضیلت ملائکہ پر اس علم کی بنا پر نو (۹) اور مفسرین نے بھی لکھا ہے (بیضاوی کی تفسیر کا عربی اقتباس) اس کے بعد آدم ابوالبشر، خلیفۃ

اللہ کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں: جنت سے جب زمین پر آئے تو غالباً دجلہ فرات کے دوآبہ میں آباد ہوئے جو اب عراق کہلاتا ہے۔ توریت میں تین صاحبزادوں کا نام آتا ہے۔ ہابیل، قابیل، اور شیث۔ توریت ہی کی حسب روایت عمر ۹۳۰ سال کی پائی، عربی میں ان کا یہ نام کس مناسبت سے پڑا؟ کسی نے کہا کہ زمین کی جلد (ادیم) سے پیدا ہوئے اس لیے آدم کہلائے، کسی نے کہا اپنی جلد کی سرخی کی بناء پر۔ ابن جبیر، عن سعید بن جبیر اور راغب اصفہانی کی تفسیر کا حوالہ دیتے ہیں۔

مزید لکھتے ہیں:

اسماء: عربی میں اردو سے زیادہ وسیع ہے۔ لفظی ولغوی تفصیل کے لیے راغب اصفہانی، تاج العروس اور قرطبی کی عبارتیں نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ محققین نے مراد معلوماتِ اشیاء سے لیے ہیں اور اسماء کے ساتھ مسمیات اور ذوات وخواص اشیاء کو شامل کیا ہے۔ اور اشیاء کے اسماء سے مراد ان کے آثار وخواص کا علم لیا ہے گویا سارے علوم تکوینی آدم و بنی آدم کو ودیعت کردئے گئے (اس کے بعد راغب، کشاف، تفسیر کبیر اور المنار کے ضروری اقتباسات نقل کرتے ہیں) اور صاحب تفسیر مظہری کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

مراد اسماء سے اسماء الٰہی ہیں انھیں کا علم اجمالی کامل آپ کو مل گیا تھا۔ اور ہر اسم وصفت کے ساتھ ایسی مناسبت تامہ آپ کو پیدا ہوگئی تھی کہ آپ جس کسی اسم وصفت کی طرف توجہ کرتے وہ اسم یا صفت فوراً آپ پر متجلی ہوجاتی مثلاً جب اسم پاک الاول کی تجلی آپ پر ہوئی تو ہر گزری ہوئی چیز آپ پر منکشف ہوگئی، اس طرح جب اسم پاک الآخر کی تجلی ہوئی تو ہر آنے والی چیز معلوم ہوگئی اور اس پر قیاس سارے اسماء الٰہی کا کیا جاسکتا ہے۔ اللہ اکبر! یہ مقام انسان کی فضیلت کبریٰ کا، حیف ہے کہ یہ خلیفۃ اللہ دیوتا پرستی، ملائکہ پرستی میں مبتلا ہوجائے... کلہا کی تصریح سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ تکوینی سلسلہ میں معرفت اشیاء ساری کی ساری انسان کو ہوکر رہے گی اور اس لیے علوم کے سلسلہ میں بھی بے شمار منزلیں طے کرتا ہے۔[۳۱]

۳-اشاریے

انگریزی ترجمہ وتفسیر میں کئی قیمتی اشارے خود مصنف گرامی نے کیے لیکن اردو تفسیر اس سے محروم رہی۔ ایک جگہ خود تحریر کرتے ہیں: بیسویں صدی کے ثلث آخر میں کوئی کتاب وہ بھی ضخیم چھپے اور انڈکس (اشاریہ) سے خالی ہو، مصنف کی کم نصیبی کے سوا اور کس چیز پر اسے محمول کیا جائے، لیکن اپنی بدنصیبی تو اس سے بھی بڑھ کر نکلی انڈکس کیا معمولی فہرست مضامین کا انتظام بھی اس کے لیے نہ ہوسکا۔ پڑھنے والوں کو اس خامی سے جس زحمت کا شکار ہونا پڑے، اس کے لیے بجز درخواست عفو کے اور کہا بھی کیا جاسکتا ہے۔[۳۲]

خوش کا مقام ہے مولانا محمد محتشم ندوی نے جلد پنجم تا ہفتم کا اشاریہ نہایت تندہی اور محنت سے تیار کردیا ہے جن کے ذریعہ ان مجلدات میں شخصیات، کتابیات، مقامات، اقوام وقبائل، جانور، کیڑے مکوڑے، پہاڑ دریا، حکومتیں، سلطنتیں، ایجادات، عقائد ونظریات، مطعومات ومشروبات، دھاتیں، اہم واقعات وغیرہ کا علم قاری/محقق کو بآسانی ہوجاتا ہے۔ کاش باقی جلدوں کے اشاریہ کا کام بھی ہوجاتا تو مفید ہوتا۔ انھوں نے ان جلدوں کے اندر مذکور مراجع کی بھی ایڈیٹنگ کردی ہے۔

خاتمہ بحث

تفسیر ماجدی اتحاد بین المسلمین کے لیے ایک شاہکار تفسیر ہے۔ تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے کا خوبصورت مرقع پیش کرتی ہے۔ یہ تقابل ادیان پر نہ صرف روشنی ڈالتی ہے بلکہ اسلامی عقائد کی برتری کو عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کرتی ہے، مزید یہ کہ خود مستشرقین کی تحریروں سے قرآن کی متعدد جہات کی توثیق وتائید کرتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ تفسیر ماجدی کے ذریعہ متعدد شرعی امور میں اسرار شریعت کی دلکش تعبیر اور قابل تقلید بیانیہ منظر عام پر آگیا ہے، جس کی اہمیت عصر جدید میں دوچند ہوجاتی ہے۔ اس تفسیر میں اسباب نزول، مضامین وموضوعات اور ربط ومطالب کی سرخیاں اگرچہ الگ سے نہیں لگائی گئی ہیں لیکن تمام ہی سورتوں میں ان ضرورتوں کی تکمیل کسی نہ کسی طور پر کردی گئی ہے۔

تفسیر ماجدی میں مصنف نے اپنی تمام آراء کو کسی معتبر عالم، مفسر، محدث، فقیہ، نحوی وصرفی ماہر فن اور متکلم اسلام کے ساتھ مربوط کیا ہے اور اس کی عربی عبارت بھی نقل کردی ہے۔ ممدوح گرامی نے اپنی ذاتی آراء، اختلافی نوٹس اور لطائف کا بھی جابجا اظہار کیا ہے۔ صوفیانہ آراء واحساسات سے استفادہ کیا ہے ساتھ میں غالی صوفیا پر تنقیدیں بھی کی ہیں۔ مولانا دریابادی نے ضمائر کے مصداق، آیات سے مستنبط مسائل، مصطلحات کی تشریح اور اردو زبان میں عربی مبین کی ''نزاکت'' کو اردو زبان میں منتقل کرنے کے سلسلہ میں جس محنت شاقہ اور حذق ومہارت کا ثبوت دیا ہے وہ انہی کا خاصہ ہے۔ درحقیقت اپنی صدی کی اس بے نظیر تفسیر کا شایان شان استقبال کیا جانا چاہیے کیوں کہ مسلک، مشرب اور جماعت سے اوپر اٹھ کر اس سے استفادہ امت اسلامی کی ثقافتی، تمدنی اور دینی وروحانی سربلندیوں کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ اس حقیقت کے اظہار میں مضائقہ نہیں کہ مولانا عبدالماجد نے بطور خاص سائنسی موضوعات پر جو اضافے/تنقیدیں کی ہیں وہ از سرنو غور وفکر کے طالب ہیں، جن کا تعلق اردو اور انگریزی دونوں تفاسیر سے ہے۔

☆☆☆

حواشی وتعلیقات

۱۔ مولانا عبدالماجد دیابادی کی مکمل سوانح حیات اور خدمات کے لیے رجوع کریں: Abdul Raheem Kidwai, From Darkness into Light-life and works of Mawlana Abdul Majid Daryabadi (1892-1977), Ahsan Publications, Springs, Sauth Africa, 2013

۲۔ فاروق ارگلی، عبدالرحیم قدوائی، مجاہد علم وعمل، فرید بک ڈپو، پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۷ء، ص۱۷۲

۳۔ تفسیر قرآن، تفسیر ماجدی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، بارہفتم، ستمبر ۲۰۱۶ء، افتتاحیہ نمبر(۱) ص۳۷

۴۔ صدق جدید، لکھنؤ، جلد نمبر ۲۳، شمارہ نمبر ۶، مؤرخہ ۶ جنوری ۱۹۷۳ء

۵۔ ماہنامہ صبح صادق، اکتوبر ۱۹۵۴ء

۶۔ ماہنامہ برہان، دہلی، جنوری ۱۹۷۷ء

۷۔ ماہنامہ الفرقان، جنوری ۱۹۷۷ء، بحوالہ تفسیر ماجدی، جلد ہفتم، آخری صفحات

۸۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، حوالہ سابق، ص۱۶

۹۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، حوالہ سابق، ص ص۱۰-۱۱

۱۰۔ تفسیر ماجدی، ص۳۰

۱۱۔ ان کی طویل مراسلت ان کی کتاب ''حکیم الامت'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ بطور مثال ''بقرہ'' کا ترجمہ بیل کے بجائے گائے سے کرتے ہیں، ملۃ ابراہیم حنیفا میں جمہور مفسرین کا اتباع کرتے ہوئے ''حنیفا'' کو ابراہیم سے متعلق مانا ہے، ملت سے نہیں۔ ان الذینَ کَفَروا سواءٌ علیهم میں کشاف کا اتباع کرتے ہوئے سواء علیهم کو حال مانا ہے۔ (تفسیر ماجدی، اول، ص۱۹)

۱۲۔ تفسیر ماجدی، حوالہ سابق، ص۲۸

۱۳۔ ترجمہ کے دیگر مسائل اور ان کے حل کے لیے دیکھیے افتتاحیہ نمبر (۱)، تفسیر ماجدی، جلد اول، ص۲۷-۳۰، افتتاحیہ نمبر (۲) ص۴۲-۴۳، افتتاحیہ نمبر (۳) ص۴۶-۴۷، نیز دیکھیں تفسیر ماجدی، جلد اول، ص۱۱۴، ۱۱۵، ۱۸، ۸۸

۱۴۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص۳۲، مزید دیکھیں وہی مصدر، ص ص۴۲-۴۶

۱۵۔ اس مقام پر اہل سنت کی ۱۴ تفسیروں کا یکجا ذکر کیا ہے جن کی عربی عبارتوں کو ممدوح گرامی نے اپنی پوری تفسیر میں بکثرت نقل کیے ہیں۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، حوالہ سابق، ص۳۳-۳۵

۱۶۔ تفسیر ماجدی کی خصوصیات اور اس کی انفرادیت، از مولانا عبداللہ عباس ندوی، بحوالہ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص ص۲۲-۲۴

۱۷۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، طبع سوم، ۲۰۰۶ء، حاشیہ ۱۶۵

۱۸۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد دوم، ص۹۵۲، طبع چہاردہم

۱۹۔ تفسیر ماجدی، محولہ بالا، ص ص۲۱۷-۲۱۸، مزید دیکھیں: وعلی أبصارِهم غِشاوَةٌ کی تفصیل میں (اعیاہ) استثناء (زبور) جہنم کا ذکر حضرت مسیح کے ٹھنڈے مواعظ میں، متیٰ ۱۸:۸، ۹ (تفسیر ماجدی، جلد اول: ۹۹)، سمندر میں فرعون کا مع اپنے لاؤ لشکر کا پانی میں غرق ہونا توریت باب خروج ۱۴:۲۱، ۲۲، ۲۹، ۳۰، ۲۴، ۲۸، میں صراحت، تفسیر ماجدی، اول، ۷۶، ۱۴۵-۱۴۶

۲۰۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، محولہ بالا، ص ص۳۹-۴۰

۲۱۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، محولہ بالا، ص ص۳۹-۴۰

۲۲۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص۱۰۹، حاشیہ نمبر ۱۰۴

۲۳۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص۱۱۱، حاشیہ نمبر ۱۰۶

۲۴۔ سورۃ البقرہ، حاشیہ ۱۱۰، ص۱۱۳-۱۱۴

۲۵۔ تفصیل کے لیے رجوع کریں (افتتاحیہ، (۱)، ص ص۳۳-۳۷

۲۶۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص ص۴۵-۵۰

۲۷۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص۵۲، حاشیہ ۸

۲۸۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص۵۲، حاشیہ ۹

۲۹۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص۵۳، حاشیہ ۹

۳۰۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص۵۶، حاشیہ ۱۴

۳۱۔ تفسیر ماجدی، جلد اول، ص۱۱۸، حاشیہ ۱۱۳

۳۲۔ زیر عنوان: مکرر، بتاریخ فروری ۱۹۶۸ء، ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ، جلد اول، ص۲۸